

عائشہ خان

# دل میں تجھی کی آہو



”امی جان! مجھے یہ شادی وادی ہرگز نہیں کرنی۔ بس آپ صاف صاف پھوپھو کو بتادیں۔“  
 ”نہیں۔ ہیں، دماغ تو نہیں چل گیا، کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔“ انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں امی جان، مجھے انزلہ تپا اور ارمان والا حال قطعاً قبول نہیں۔ کیا رکھا ہے شادی میں ہر وقت کی طعن و تشنیع، سرزنش اور ملامت۔“ وہ بے حد لکڑی سے بولی۔

”عروہ! کیسی باؤلواں جیسی باتیں کر رہی ہو، ہرگز نہ کا اپنا مقدر ہوتا ہے اپنی پھوپھو کو کھو کیسی جان دینی پیرا تم پر۔ یہی حال راول کا ہے تم تو بڑی بخت آور ہو۔“  
 ”یہی۔ ایسا سسرال تو شاذ و نادر ہی ملتا ہے اور پھر۔۔۔“ ان کا جملہ ابھی منہ میں ہی تھا کہ راول کی موٹر سائیکل کے بارن نے اس کے آنے کی اطلاع دی اور عروہ کا دل حسب معمول بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ اللہ کس قدر مشکل ہے من چاہے بندے سے منہ موڑنا۔ زندگی میں سارے رنگ تو اسی شخص اور اس سے وابستہ بندھن کی بدولت ہیں۔ یہ تصور ہی کس قدر ازیت ناک ہے کہ اس شخص سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اس نے خود کو کرب کی گہری کھائیوں میں اترتا محسوس کیا۔

”سنو عروہ! خبردار جو تم نے راول سے کوئی الٹی سیدھی بک بک کی تو۔“ امی جان نے سختی سے اسے تنبیہ کی اور وہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔  
 ”بھئی وہ ہمیشہ کی طرح مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔“  
 ”السلام علیکم مہلانی جان! واہ آج تو بڑے موقع پر آیا ہوں۔“ اس نے ایک شوخ سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور پلٹ اپنی طرف کھکھکاتے ہوئے پکڑا اٹھا کمرنہ میں رکھ لیا۔

”دیری۔۔۔ سنبھل۔“ اس نے مزے سے چٹکارہ لیتے ہوئے کہا۔ ”مہلانی جان! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ مما بتا رہی تھیں کہ آپ کے پاؤں میں موج آگئی ہے۔“ اب وہ توجہ سے امی جان کی طرف دیکھتا ہوا

عجبت سے پوچھ رہا تھا۔

”نہو نہی معمولی سی موج تھی، آئیوڈینس کی مالش کی تھی انزلہ نے۔ اب تو ٹھیک ہے۔“ انہوں نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”عروہ راول کو نجی چائے دو۔“ انہوں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔  
 ”نہ لیں چائے۔“ وہ کپ اس کی طرف برہمائے دیکھنے سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ راول نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”اوہو میں نے تو کوشش چڑھایا ہوا تھا۔“ امی جان جلدی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ وہ بظاہر سرد مہر کی مصنوعی لباوہ اوڑھے تھی مگر دل کو نگاہ کو اس کی سے انسانی نگاہوں سے کیسے بجا رہی تھی یہ وہی جانتی تھی۔  
 ”کیا ہوا۔۔۔ چائے نہیں پینی؟“ اس کی بخور کشتی جا بختی نگاہ سے گھبرا کر اس نے پوچھا۔

”یہ خوب صورت ہاتھ اگر زہر بھی پلائیں تو میں شوق سے پی لوں گا یہ تو پھر چائے ہے۔“ اس کے لیے میں دھڑکنے والی جذبے ایک لمحے کو اسے ڈگمگائے لیکن اگلے ہی بل اس نے خرد کو سنبھل لیا اور چائے اس کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے درختے میں جا کھڑی ہوئی۔ راول اس کے اس گریز پر حیران رہ گیا پھر وہ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا اتنے قریب کہ اس کے بدن سے اس کی لولیاں کی ولولیں محسوس ہو رہی تھیں عروہ کو بے خود کر کے لگی۔ اسے اپنی اٹھل پھل ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ وہ جو اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اس کا حبیب تھا۔ جو رگ جہاں سے بھی قریب تھا۔ اس کے جذلوں کو رد کر کے بول یکا یک اس سے منہ موڑ لیا۔ کس قدر محال تھا۔ عروہ آخر کیا کرتی، انزلہ آیا کی زندگی جیسے روتے سکتے گزر رہی تھی۔ تو اس کے ساتھ تھی اس پر مستزاد یہ کہ ہمسائے میں جہاں کو غلو نہ لے جو اس کا سگا خالہ زاد بھی تھا طلاق دے کر بچے کو اس سے چھین کر اسے گھر سے نکل دیا تھا۔ عروہ جو پہلے ہی شادی سے خوف زدہ تھی مگر امید دیم کے گرداب میں چکرارہی تھی اس واقعہ نے اسے اس بندھن شادی سے بالکل ہی برگشتہ کر دیا۔ پھوپھو ساس کے روپ میں

اور راول خاوند کے روپ میں عجیب عجیب اور ڈراؤنے  
 دہلے بنا کر اسے ڈرانے لگے۔ اس کا سکون و چین  
 بالکل تباہ ہو کر رہ گیا۔ پتا نہیں کیسے کیسے خدشے اور  
 وابہ ہر وقت اسے گھیرے میں لیے رہتے۔ وہ سوچتی  
 کیا فائدہ اس تعلق کا۔ اس رشتے کا جس میں ظاہری  
 قربتیں تو برہہ جاتیں مگر روحانی روابط ناپید ہو جائیں۔  
 جس میں جسمانی لحاظ سے تو انسان ایک دوسرے کے  
 قریب ہو لیکن روحانی طور پر دور ہو۔ جس میں ظاہری  
 دریاں تو مٹ جائیں لیکن باطنی بعد میں اضافہ  
 اور جانتے۔

بہت سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ  
 راول سے شادی نہیں کرے گی اس طرح کم از کم اس  
 کے پاس محبتوں اور چاہتوں سے لبریز کچھ لفظ تو ہوں  
 گے۔ چاہے جانے کا تقاضا بھرا کیف آگیاں احساس تو  
 اس کی یادوں کے چمن میں مہکتا رہے گا۔ رستہ کی  
 لمبیوں سے نگاہ چرا کر ماضی کے خوشگوار لمحات سے  
 اند ساعیتیں مستعار لے کر جب وہ اس چمن میں رہے تو  
 انے کو کھو جے گی تو زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کی  
 دو تین برداشت کرنے کے لیے زاد راہ کے طور پر  
 ت کچھ ملے گا۔

مگر اب جب اس فیصلے پر عمل کی گھڑی سر پر پہنچی  
 اسے احساس ہوا کہ یہ فیصلہ کرنا تو سہل ہے مگر اس پر  
 عمل کرنا بے حد دشوار ہے۔ دل تو اسے دیکھتے ہی مچنے لگا  
 ماسکروہ تہہ کر چکی تھی کہ دل کے کے میں نہیں آئے  
 گے۔ دل کا کیا ہے یہ تو ضدی بالک کی مانند ہے اور  
 ہاں کی ساری ضدیں کب پوری کرنے کی ہوتی ہیں۔  
 اس نے سوچا اور اس کی سرخ لہرو آکھوں سے چھلکتے  
 چھلکے سے خود کو بچانی وہ تھکاتی تھکاتی گھرے سے نکل  
 لی اور راول گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ بہت زیادہ باتیں تو وہ  
 نے بھی نہیں کیا کرتی تھی مگر قطعاً "لا تعلق" اور سرد  
 ی لیے یہ انداز تو اس کے لیے بالکل نیا تھا اور بے حد  
 نافہم بھی۔

وہ آؤٹ پر اسلام آباد جا رہا تھا اور اس وقت سب  
 ملنے، خاص طور پر اسے جاتے وقت دل بھر کر دیکھنے

ہی کی غرض سے آیا تھا۔ دل کیفیت پہلے ہی کچھ عجیب  
 سی ہو رہی تھی اور وہی سہی کسر اس کے رویے نے  
 پوری کر دی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ اس سے  
 ایسی کون سی خطا سیر زد ہو گئی تھی جو وہ یوں اس سے بے  
 اعتنائی برت رہی تھی؟ راول کا ذہن بے حد براؤندہ سا  
 ہو رہا تھا۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر لیے کچھ دیر  
 ماموں ممانی کے پاس بیٹھا رہا۔ دل میں یہ امید بھی تھی  
 کہ شاید وہ لبوں پر وہی شرمیلی سی مسکراہٹ لیے  
 اچانک آکر اسے حیران کر دے، شاید وہ یونہی اسے تنگ  
 کر رہی ہو مگر جب کتنی ہی دیر گزر گئی اور اس نے آکر  
 جھانکا تک نہیں تو راول کو اپنی خوش فہمیوں پر سخت  
 فیصلہ آیا۔ نشت ہے تم پر راول تمہیں بھی یہی لڑکی ملی  
 تھی دل جیسی انمول متاع لنانے کو۔ اس نے انتہائی  
 رنج اور کوفت کے عالم میں خود کو ڈپٹا اور بے دلی سے  
 ماموں، ممانی سے ملنے کے بعد شکستہ دل اور مایوس، کوچہ  
 جاناں سے نکل آیا۔

سارا راستہ عجیب سی بے کلی نے اس کے وجود کا  
 احاطہ کیے رکھا۔ ڈھیلے ڈھیلے سے انداز میں چلتا جب وہ  
 گھر میں داخل ہوا تو ماما اور شبنم اسے اتنی جلدی آتے  
 دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

شبنم: "تو ہے بھائی! کیسے کالی ملی تو راستہ نہیں  
 کاٹ گئی؟" اس نے وہی آپ لگتے تو نہیں ہیں کہ  
 راستے سے ہی پلٹ پڑیں۔ خاص طور پر جب راستہ  
 بھی عروہ کے گھر کا ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

"میں زرا دیر کے لیے ملنے گیا تھا۔ وہیں رات بسر  
 کرنے کا تو ارادہ نہیں تھا میرا۔ اور یہ تم کیا ہر وقت عروہ  
 کے نام کی ملا جھتی رہتی ہو؟" اس کے روئے سے لہجہ  
 پر ماما اور شبنم دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا  
 وہ کچھ اکتایا اکتایا اور پریشان سا نظر آیا۔

"کیا بات ہے راول! کوئی الجھن یا پریشانی ہے؟"  
 انہوں نے حلاوت بھرے انداز میں پوچھا۔

"نہیں ماما ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے ایسا  
 کیوں محسوس کیا ہے۔؟" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے  
 نارمل سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”مہم پچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو راول بیٹا! بھائی صاحب کے گھر تو خیریت تھی؟“

”مہم ٹھیک ٹھاک ہے مہم، مہمانی جان کر رہی تھیں کسی وقت آپ چکر لگائے گا، شبینہ! تم نے میری شرٹس واش کر دی تھیں؟“ ماں کے مزید کسی سوال سے بچنے کے لیے وہ جلدی سے شبینہ کی طرف مڑ کر پوچھنے لگا۔

”کب کی۔۔۔ پر بس بھی کر دی ہیں میں نے۔“

اس نے جلدی سے بتایا۔  
”واہ بھئی بڑی سکھو بی بی بن گئی ہے ہماری شبینہ تو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ مگر اس کے چہرے پر چھایا غبار شبینہ کی آنکھوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ بھائی کے پیچھے ہی چلی آئی۔

”کیا ہو گیا بھائی۔؟ کہیں عروہ سے جھگڑ کر تو نہیں آ رہے؟“ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی راز داری سے پوچھنے لگی۔

”بات مت کر اس بد تمیز لڑکی کی اتنی دور سے ملے گیا تھا مگر سیدھے منہ بات تک نہیں کی جنبہ نے۔ حد ہوتی ہے بے موتی کی۔“ وہ جو بے حد بھرا بیٹھا تھا بے اختیار کہہ گیا۔

”کمال ہے بھائی، اتنی سی بات پر آپ یوں مواصلاتی غبارے کی طرح پھول رہے ہیں ممکن ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو، ماموں، مہمانی سے ڈانٹ بڑی ہو۔ آفتاب سے جھڑپ ہو گئی ہو یا پھر وہ انزلہ آیا گی وجہ سے پریشان ہو۔ کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ اس نے اتنے ہلکے پھلکے انداز میں بات کی کہ وہ اس کی عقل مندی کا قائل ہو گیا اور بڑی حد تک مطمئن بھی۔

☆ ————— ☆

وہ چار لڑکے تھے جو اپنے کالج سے آؤٹ پر آئے تھے۔ بے حد محنت طلب کام تھا۔ سارا سارا دن مغز ماری کرنی پڑتی۔ دماغ شل ہو کر رہ جاتا۔ لیکن جو نمی ذرا سی فرصت میسر آتی وہ چم سے اس کے تصور میں آمو جو ہوئی اور ساری محنت پل میں ہوا ہو جاتی۔

وہ برسات کی بھیگی بھیگی سے صبح برور شام تھی جب وہ ایک ماہ یعنی پورے مہینوں کے بعد نگاہوں میں وید کی پیاس اور دل میں ہلکتے شوریدہ سرحدیوں کے ساتھ کوچہ جاہاں میں داخل ہوا۔

سی گرین کائن کے شلوار سوٹ میں ملبوس اپنی تمام تر حشر سمانیوں کے ساتھ وہ سامنے ہی انزلہ آئی کے ساتھ محو گفتگو تھی، ساتھ ساتھ سبزی بن رہی تھی۔

”السلام علیکم! محترم خواتین۔“ اس کے برعکس سلام پر عروہ نے بمشکل اپنے اٹھل پھل ہونے دل کو سنبھال کر نگاہیں اٹھائیں۔ وہ تمام تر احتیاط بلائے طاق رکھے، ایک ایک اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

جینز کی اپینٹ اور جدید طرز کی سلی ہاف آستین کی فی شرٹ میں وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کی راہ دل میں کھجا جا رہا تھا اور وہ اپنی تمام تر طاقت صرف کیے دل کو سمجھانے میں، منانے میں مصروف تھی۔ مگر اس کی تمام تر سعی اس کی بحر طراز آنکھوں سے چھلکتے فسوں خیز جذبوں اور بے نازیروں کے سامنے دکارت جالی نظر آرہی تھی۔ وہ تو اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ اس کے اندر باہر ہر طرف ہی وہ تو تھا۔ ایسے میں کس قدر مشکل تھا اس سے پہاڑ تھی کرنا۔

کتنے بے شمار سداویاں تھیں دنوں کے بعد وہ اس کے سامنے اپنے حسن کی آبنائیاں بکھیر رہی تھی اس کے اندر تک سکون اتر آیا۔ ہر طرف سکھ ہی سکھ تھا۔ شانتی ہی شانتی تھی۔

”کیسے ہو راول؟ کب آئے اسلام آباد سے؟“ انزلہ آنے پوچھا تو وہ اپنی بے خودی پر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ ”کچھ دیر قبل ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے کہ میں نے شامی کباب بنائے ہیں اور عروہ نے پکوڑے تھو میں لائی ہوں۔ تم کھا کر بتانا کس کی ڈش ہے۔ ویسے تمہیں تو عروہ ہی کی گئی۔“ انہوں نے اسے جھل سا دیکھ کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔ ان کے تھکتے ہی وہ بھی اٹھنے کے لیے

نظر آنے لگتی ہے یہ اسے آج اسی بل معلوم ہوا تھا۔

اپ کا مسٹر ہے۔  
 ”اپنی ایک ہی بسن کو بھلا سکتا ہوں بھلا میں۔“  
 راول نے پیار سے اس کے بال بکھیرتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”اور تمہیں تو شاید نہ بھولیں مگر جہاں آپ جا رہے  
 ہیں نا۔۔۔ وہاں جا کر سب کچھ بھول سکتے ہیں۔“ وہ  
 شوخی سے کہتی بائے بائے کرتی اندر بھاگ گئی اور وہ  
 مگن و مسرور گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔ وہ جو سارے رات  
 تصور ہی تصور میں اسے اپنا پر جوش استقبال کرتے دیکھ  
 آیا تھا وہاں پہنچ کر وہ حیران و پریشان رہ گیا۔ سارے

ایسی راول اس کے اس کھینچے کھینچے سے انداز پر الجھا کر  
پہرانا دہم جھٹھے ہوئے نارمل ہو گیا۔

نے پوچھا۔ "شاید نہیں۔" لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دل  
میں سے تڑپ اٹھا۔ نالہ و فریاد کرنے لگا۔ ایک لمحے کے  
لیپے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی تک تھکتے ہوئے ہو جائے  
گی ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھر جائے گی۔ اس کا دل  
ہلکا ہوا وہاڑیں مار مار کر روئے۔ کس قدر ظالم تھی وہ  
اس دل میں اس کی محبت بستی تھی اسی دل میں یہ کیسا  
صالحا مارا تھا اس نے۔ وہ گنگ سا پھٹی پھٹی نگاہوں سے  
اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے ضبط  
نا دامن تار تار ہو تا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے  
سے نکل گئی۔

5

خیال، سارے خواب، ساری توقعات دم توڑ گئیں۔  
اسے دیکھ کر اس کے احسرس لبوں پر تبسم کی ضیا میں تو  
کیا پھوٹتیں ان لبوں سے تو کوئی حرف مروت بھی نہ  
نکلا۔ نہ رخساروں پر سرخی چمکی نہ نگاہوں میں بے تابی  
جھلکی، سلام یوں پہنچ مارا جیسے وہ ایک ماہ بعد نہیں ایک  
سیکنڈ کے بعد دوبارہ سر پر آسوار ہوا ہو۔

پر شمر وہ سے قدموں سے چلتا وہ آگے بڑھتا جا رہا  
تھا۔ اپنی پسندیدہ گراؤنڈ پر اس نے نگاہ تک نہ ڈالی  
تھی۔ حالانکہ شمس کھیلنے کے بعد چند منٹ وہ ضرور اس  
گراؤنڈ کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ گولائی میں بنی اس گراؤنڈ  
میں ہمیشہ بونی عجمی اور توازن سے مشین پھرتی ہوتی  
تھی۔ چاروں طرف بنی کیاریوں کے درمیان چلتا ہوا  
نگاہوں کو تراوٹ بخشتا تھا۔ پہاڑی سے بہتا پانی مصنوعی  
آبشار فواروں کے چلنے کی ترنم آواز اور موتیوں کی  
طرح ادھر ادھر گر تاپانی اسے مہسوت سا کر دیتا تھا اور وہ  
کتنی نئی منٹ وہاں کھڑا رہتا تھا۔ آج ایک لمحے کے لیے  
بھی اسے پابہ زنجیر نہ کر سکا جنوب کی سمت چلتے چلتے وہ  
مسجد کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں ایک لمحے کے لیے رک کر  
اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ شام اتر آئی تھی اور  
ہر چیز اس کے دل کی طرح دیران اور افسردہ دکھائی دے  
رہی تھی۔ پرندے تھکے تھے اپنے ٹھکانوں کی طرف  
محو پرواز تھے۔ مسجد سے ذرا آگے دوسرے ہاتھ پر  
فوارے کے بالمقابل جو گراؤنڈ تھا وہ حسب معمول  
سنسان بڑا تھا۔ اجڑی اجڑی، اپنی تنہائیوں پر ماتم کنٹاں  
تھکے تھکے قدموں سے چلتا وہ کونے میں رکھے بیچ پر جا  
بیٹھا۔ اس گراؤنڈ میں جہاں بیٹھنا اسے بھی پسند نہیں  
رہا تھا اس وقت یہی اسے گوشہ عافیت محسوس ہو رہی  
تھی۔ انتہا خاصے رقبے پر پھیلی اس گراؤنڈ میں کوئی چیز  
بھی تو قابل ذکر نہیں تھی۔ خاصے فاصلے فاصلے پر دو چار  
کیاریاں اور بیچ تھے بے توجہی کا شکار گھاس اکثر بے  
روتق ہی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بھی اسے اپنی طرح شکستہ  
دل اور بے حد دلچسپی محسوس ہوئی۔  
کس قدر ظالم ہو تم عروہ حسین۔ مگر تم سدا کی ستم  
شعار ہو میں ہی تم سے غلط توقعات وابستہ کر بیٹھا تھا۔

بہت سے گزرے منظر، بہت سے گزرے دن اور ان  
دنوں سے وابستہ یادیں اسے اپنی طرف بلانے لگیں۔  
اور جب راول نے وقت کے بارگراں تلے دلی  
یادوں پر سے گرد جھاڑی تو یہ جان کر اس کا وجود بھر بھری  
مٹی کا ٹوہ بن گیا کہ اس کی یہ کرن جو اس کی محبت بھی  
تھی اور منگیتر بھی شروع سے ہی بچپن سے ہی اسے  
بے وقوف بناتی رہی تھی۔ خود شرارت کر کے اس کا نام  
لگا دیتی، جس کی وجہ سے کئی مرتبہ غلطی نہ ہونے کے  
باوجود راول کو ڈانٹ بھی پڑی اور مار بھی۔ کئی دفعہ اس  
نے اس کی کاپیاں گندی کر دیں مکتا میں بھاڑ دیں، لیکن  
ان سب کے باوجود نہ راول نے اس سے کھیلنا ترک کیا  
نہ ہی وہ اسے کبھی بری لگی۔ اس بات پر راول کو کبھی  
کبھی بڑی حیرت ہوا کرتی تھی مگر یہ عروہ کا وہ دور تھا جب  
دل کے نیماں خانوں میں چھپے جذبوں کو سمجھنے کی  
صلاحیت بھی نہ شعور۔

جب ابو کا ٹرانسفر ہنڈی ہو گیا اور وہ ہنڈی جا  
گئے تو اس وقت راول کو سب سے زیادہ دکھ اسی  
پھٹنے کا تھا اور اسے ہی یاد کر کے وہ بے حد اذ  
ہو جایا کرتا اور سوچا کرتا کہ کب وہ لاہور جائیں گے  
کب وہ اس سے ملے گا۔ دن جیسے گن گن کر  
رہتا ہے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وہ لاہور  
جائے گئے تو اس سے ملنے کے خیال سے۔  
خوش تھا جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔

مگر وہاں پہنچ کر اسے بے حد مایوسی ہوئی۔  
ماموں کے ہاں اسلام آباد جا چکی تھی پندرہ دن لاہور  
رہے مگر راول کا کسی شیل میں قطعاً نہ  
اس کے بعد کافی عرصہ ماما پاپا لاہور جاتے  
نہ بنا۔ اور وہ چاہتے ہوئے بھی خواہش رکھتے  
اکہا بھلا کیسے جاسکتا تھا۔ وہ ایک خوب  
تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی سی خنکی بڑی روح پرور  
ہو رہی تھی۔ کھیلنے کے بعد وہ تھوڑی دیر  
کے ساتھ کپ شپ لگایا کرتا تھا مگر ان ہاتھ  
تھی کہ کسی بات میں چارم محسوس نہیں  
دل چاہتا تھا فوراً "گھر پہنچ جائے آخر"

اجازت لیتا کلب سے نکل آیا۔

چمک بر حیران سی ہو کر رہ گئی۔

”کیسی ہو کرن؟“ وہ حد درجے اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

”فائن۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے عروہ نے دیکھا اس کی نگاہیں اب بھی بے تابی سے اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ کیسی تھیں یہ آنکھیں، پیار لٹاتی، جذبے چمکاتی، وہ بے تحاشا جھک محسوس کرتے لگی۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔

”ماموں کب تک آجائیں گے عروہ؟“ شبینہ نے پوچھا۔

”کہہ تو رہے تھے دو اڑھائی گھنٹے تک آجاؤں گا۔“

”کیس گئے ہیں ماموں جان؟“ اس نے پوچھا۔  
”وہ ابی جان کو چین سے آئی ہوئی کسی پارٹی کو ریو کرنا تھا۔ لیٹ ہو رہے تھے اس وجہ سے جتنے گیٹ پر ہی اتار کر چلے گئے تھے۔“ اس نے نگاہیں جھمکائے جھمکائے بتایا۔ اس کے اس انداز پر بے اختیار راول کے لبوں پر مسکراہٹ آٹھنری۔ بڑی ہو کر کس قدر شیریلی سی ہو گئی ہے عروہ۔ لگتا ہی نہیں یہ وہی شرارتی لڑکی ہے جو اکثر اسے بلاوجہ پٹوایا کرتی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ شبینہ ابھی ابھی اندر آئی تھی اور وہ راول کے یوں ایک ٹنگ دیکھنے پر گھبرا ابھی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں راول بھائی؟“ اس نے اتھل پھتل ہوتے دل کو ہمنوا بناتے ہوئے پوچھا۔ دل چاہا اسے بتائے کہ وہ کیسے پل پل اسے یاد کرتا رہا ہے۔ وہ جانے کس وقت چپکے سے اس کا سب کچھ چرا کر لے گئی ہے یوں کہ اب سے پہلے اسے خود بھی اس چوری کا پتا نہیں چلا۔ بے اختیاری کی سی کیفیت میں ممکن ہے وہ کچھ کہہ ہی گزرے مگر اس وقت شبینہ جوس کے تین گلاس ٹرے میں رکھے کمرے میں داخل ہوئی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”میں صرف جوس اس لیے لائی ہوں کہ پہلے تم فریش ہو جاؤ شاور لے کر۔ تب تک میں پیٹ پوجا کا

ریکٹ گھماتا وہ جونی گیٹ سے اندر داخل ہوا شبینہ سے گلے ملتی اس ہستی پر نگاہ پڑتے ہی اس کے اٹھتے قدم ختم سے گئے۔ پل کے ہزارویں حصے میں اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ ایک ٹنگ اسے دیکھ رہا تھا اور دھڑکنوں میں ایک شور برپا تھا۔ آرزوؤں کے نگار خانے میں جہاں ہر نقش آنکسی نقوش رکھتا ہے وہاں اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کو حقیقت کے روپ میں دکھانا کیسا مسرت آگیاں احساس بخشا ہے وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا، ویداریار سے حسین شاید کوئی نظارہ نہیں۔ اس نے سوچا۔ وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ فراک کی بجائے اس نے پین کمر کی قمیص سی کڑھائی والی شلوار قمیص پین رٹی تھی۔ شانوں پر کلف لگاؤ ناسلیف سے پھیلا یا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ریشمی بال جو دو پونیوں میں بندھے رہتے تھے اس وقت سینچ میں جکڑے کمر کو چھو رہے تھے۔ شبینہ کے بعد ممانے سے بے قراری سے اسے بلیچ لیا تھا۔

”میں کل شام کو ہی شبینہ سے کہہ رہی تھی کہ بڑا دل چاہ رہا ہے اپنی عروہ سے ملنے کو۔“ ممانے، بلیچ بلیچ کر کہہ رہی تھیں۔

”ایسے ہی پھوپھو! آپ تو لگتا ہے ہمیں بالکل ہی سہل گئی ہیں۔ ورنہ چھٹیوں میں تو آسکتی ہیں۔“ وہ شکوہ انیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میں کیا کروں بیٹی، تمہارے انکل میرے علاوہ کسی کے ہاتھ کا بنا کھانا پسند ہی نہیں کرتے اس وجہ میں تو بالکل پابند ہو کر رہ گئی ہوں۔“ ممانے اس پیید سپید چکنے سے گل پر پیار کرتے ہوئے اپنے نہ کی توجیہ پیش کی۔

”بھائی پہچانا نہیں آپ نے عروہ کو؟“ شبینہ کی نگاہ اس کے ساکت و جامد سیراپار انھی تو اس نے ساتھ ہی وہ بھی مڑی تھی۔ خمیدہ پلکوں والی براؤن آنکھیں اسے تنک رہی تھیں اور راول کا جیسے ان آنکھوں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ ادھر لی پر جوش سی والمانہ تکتی نگاہوں کی بے تحاشا

انتظام کرتی ہوں۔“

جوس پینے کے بعد وہ شینہ کی راہنمائی میں گیسٹ روم کی طرف چلی گئی تو ڈرائنگ روم ایک دم خالی خالی لگنے لگا۔ ہر چیز جیسے بے رنگ سی ہو گئی۔ اپنے ان محسوسات پر راول حیران حیران سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے میں جانے سے قبل اس نے کچن میں جھانکا۔ ماما بڑی مسرور سی بیٹیجی کے لیے اہتمام کرنے میں مصروف تھیں۔

”ماما! آپ تو بھول خوش ہیں جیسے کسی ریاست کی شہزادی آئی ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔  
”میری بیٹی کسی شہزادی سے کم ہے کیا۔ پھر اتنے عرصے بعد تو آئی ہے۔“

”گویا جلدی جلدی آنے لگے تو پھر آپ خوش نہیں ہوں گی۔“ راول کو اس کی باتیں کرنے میں مزا آنے لگا۔

”کیوں نہیں ہوگی خوشی۔ میرا تو بس چلے تو بس ابھی سے اسے ہمیشہ کے لیے گھر لے آؤں۔“ وہ اپنے دھیان میں مصروف سے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ راول کی دھڑکنیں یہ سن کر الوہی سے نفٹے کھٹانے لگیں۔ دل خوشی سے جھومنے لگا۔ ہر طرف جیسے رنگ ہی رنگ بھر گئے، فضا میں مشک بار ہو گئیں۔ بے اختیار راول کا دل چاہا بڑھ کر ماما کا منہ چوم لے جو اس کے کہے بنا اس کے دل کی خواہش جان گئی تھیں۔

”بھائی یہاں کیوں کھڑے ہیں جلدی سے ڈریس چینج کر لیں نا۔“ شینہ نے پیچھے سے کہا تھا اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا مبادا وہ اس کے چہرے سے اندر کا حال نہ جان لے۔

اپنا بہترین لباس زیب تن کیے وہ کب سے شینہ میں ہر طرف سے اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ لختی دیر پاں سیٹ کرنے میں لگائی تھی۔ وال کلاک کی جانب نگاہ کی اور پھر حیران رہ گیا۔ اتنا ٹائم تو اس نے کبھی بھی نہیں صرف کیا تھا تیاری میں، جتنا آج لگا چکا تھا۔ کیا محبت میں ہر انسان ایسا ہی انتہا پسند سا ہو جاتا ہے جیسے میں ہو رہا ہوں۔ ہاں محبت ایسا ہی جذبہ ہے، محبت کی

امر نبل من کے درجوں سے لپٹی ہے تو ہر چیز سرسبز و شاوَاب دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہر سو ہمار ہی ہمار دکھائی دیتی ہے۔ سائیں محبوب کے خیال سے ہی مسکنے لگتی ہیں۔ تصور کے افق پر ہر دم محبوب کا چہرہ جھلکاتا ہے اور اس چہرے پر قوس قزح کے رنگ ایسے دلفریب اور حسین دکھائی دیتے ہیں کہ اس نظارے کے سامنے دنیا کا حسین سے حسین منظر بھی ماند پڑ جاتا ہے۔

ڈھیر سا راپر فیوم اسپرے کر کے جب وہ کمرے سے نکلا تو ہر سو جیسے خوشبو ہی خوشبو بکھر گئی۔ ماموں جان آچکے تھے بڑی گرم جوشی سے اس سے ملے۔ ماما مسرور سی بھائی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ شینہ اور وہ ڈھیروں کھانے کے لوازمات سامنے رکھے باتوں میں مگن تھیں۔ اس کی آمد کا اس ستم شعار نے کچھ نوکس ہی نہیں لیا تھا۔ راول کو اپنی ساری تیاری بے کار نظر آئی۔ وہ سخت جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ ماموں اس سے اس کی اسٹڈی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ فیوج میں اس کے کیا عزائم تھے جانا چاہتے تھے۔ وہ دلی کیفیت پر قابو پا کر احترام سے ان کی باتوں کا جواب دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ماموں بیٹی ماما سے باتوں میں ممد و ف ہو گئے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ یہاں کیا کرے۔ وہ خود کو بالکل گاؤدی سا محسوس کر کے بے چینی سے پہلو بدلتے لگا۔

”بھائی! اتنی دور کہاں بیٹھے ہیں یہاں آجائیں۔ بڑے مزے کی چیزیں بنائی ہیں ماما نے۔“ شینہ کو آخر اس کا خیال آئی گیا اور وہ تو جیسے بڑاؤے کا ہی منتظر تھا فوراً ان کے برابر والے صوفے پر آ بیٹھا۔

”یہ تم لوگ کھا رہی ہو یا سوٹھ رہی ہو۔“  
”بیٹا جی یہ بھی کیا کریں اگر صحیح طرح سے کھا لیں تو باتوں میں کچھ گپ آتا ہے اور یہ انہیں منظور نہیں۔“ ماموں جلانے مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جھینپ سی گئیں۔

اسی وقت پاپا بڑے جوش و خروش سے ساا کرتے ڈائنگ روم میں داخل ہوئے۔  
”میں لیٹ تو نہیں ہوا نا؟“ وہ بڑے تپاک



”کیا کروں عاتکہ۔ دفتر کی ساری ذمہ داری تو میرے اوپر ہے۔ اب یہ جو چینی پارٹی آئی ہے اسے ڈیل کرنا ہے۔ ارباب صاحب خود تو ملک میں ہوتے نہیں۔ سب کچھ میرے اوپر چھوڑ رکھا ہے اس لیے میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ انہیں میری طرف سے مایوسی نہ ہو۔“ انہوں نے تفصیل سے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

”عروہ سینڈائیر کے ایگزٹام ذمے لے تو میں نظای صاحب کو یا راول کو بھیجوں گی کچھ دنوں کے لیے بھیج دیجئے گا رہنے کے لیے۔“ وہ بھائی سے کہہ رہی تھیں اور راول ابھی سے دل ہی دل میں حساب لگانے لگا تھا کہ ایگزٹام میں کتنے ماہ رہتے تھے۔ پھر اس نے سارا عرصہ یہی حساب کرتے گزارا تھا۔ کئی مرتبہ فون کیا کہ شاید وہی دشمن جاں اٹھا۔ لے مگر ہر مرتبہ ہی ناکامی ہوئی۔ وقت کی رفتار لگتا تھا جیسے تھمسی گئی تھی۔ دن کچھوے کی چال کی مانند ریت ریتے ریتے گزر رہے تھے یا اسے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا۔ ہر دم بس یہی خیال اسے گھیرے رہتا تھا کہ کب اس کے ایگزٹام ختم ہوں گے۔ کب وہ آئے گی۔ پتا نہیں ماما کو یاد بھی ہے یا نہیں۔ بس ہر دم وہ ایسی ہی باتیں سوچتا رہتا۔ کتابیں کھولتا تو ہر ورق سے اس کا بچہ بھاگنے لگتا۔ کتنے بے شمار دنوں کے بعد خود کو کافی تنہا سمجھا کر آخر اس نے پوری تنہائی سے پڑھنا شروع کیا۔

بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ درخت سبز پتوں کا پیرا بن چکے۔ سرشار تھے۔ پودے پھولوں سے لگے جگے تھے۔ اس شام موسم بے حد خوشگوار تھا۔ صبح اس کا ٹیسٹ تھا اور طبیعت بھی کچھ ست سی ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے آج وہ ٹینس کھیلنے بھی نہیں گیا تھا۔ پڑھتے پڑھتے تھکن سی محسوس ہونے لگی تو وہ کتابیں بند کر کے کمرے سے نکل آیا۔ لاؤنج سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ ادھر ہی چلا آیا۔

”شکر ہے بھائی آپ آگئے۔ ورنہ میں سخت بور ہو رہی تھی۔ ماما تو میری بات ہی نہیں سن رہیں۔“ شبنم اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولی۔ راول اس کے سر

وہاں سے گلے ملتے پوچھ رہے تھے۔  
”ٹیسٹ ہو جاؤ اور تمہارے خیال میں تو ایسا ممکن ہے۔“ ماماں جان نے فراخ دل سے ان کی تعریف کی۔

”بس یار جو نہی تمہاری بہن کا فون ملا کہ جلدی نہ پھینچیں تو میں فوراً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، مبادا دیر ہو جائے اور ٹیکم کی جھڑکیاں سننی پڑیں۔“ وہ ماما کی دیکھتے شرارت بھرے انداز میں کہہ رہے تھے۔ وہ بری طرح جھینپ کر نگاہیں چرا رہی تھیں۔ جان کھلا کھلا کر نہیں دیتے۔ ماماں جان اور پاپا میں فرسٹ کزن بھی تھے اس لیے آپس میں بے رحمی بھی تھی۔ اس وقت بچی کزن اور سالے کی آمد بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ عروہ کو انہوں نے سلام نہیں کیا۔

عروہ نے جب دیکھا کہ انکل تو اس سے ملے بغیر ہی گئے ہیں تو وہ جلدی سے آگے بڑھی۔  
”السلام علیکم انکل میں بھی موجود ہوں یہاں۔“  
”ہن، میرا بھی کچھ تعلق ہے آپ سے۔“ اس کی بات پر سب بے اختیار مسکرا دیے تھے۔ پاپا نے مڑے۔

”ابھی واقعی تم عروہ ہو۔ مگر عروہ تو اتنی ذرا سی تھی۔“ پھر مسکرا کر اس کے سر پر بوسا دیتے ہوئے ”اب تم کہہ رہی ہو تو مانے لیتے ہیں کہ تم ہی ہو۔“ حسین تم کیا کہتے ہو، مانیں یا نہ مانیں؟“  
انے شرارت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے بری طرح جھینپ گئی۔ رخسار پل میں لال سے راول دلچسپی سے، شوق سے یہ منظر دیکھتے

ان ایسے گزر گئے تھے جیسے دوپیل۔ وقت کو می کیسے پر لگ جاتے ہیں۔ راول نے بے کلی

”بھائی! آئے بھی ہیں تو اتنی جلدی جارہے ہیں تو اور رہتے نا۔“ ماما افسردگی سے کہہ

کون ہو سکتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔  
 ”کہاں کھو گئے بھائی؟“ شینہ شوخی سے اس کا  
 کندھا ہلاتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ اسے تصورات کی  
 کو خیر یاد کمنابا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو ریموٹ کنٹرول سے آواز بند  
 کرتے ہوئے ماما بھی ان کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

”ماما! آپ جس طرح محو ہو کر شاعری سنتی ہیں  
 مجھے خواہ مخواہ ان شاعروں سے چڑھوس ہونے  
 ہے۔“ اس نے ان کا ہاتھ تھام کر لاڈ سے کہا۔

”جب تم میوزک پر سر دھنتی ہو تو ماما کو تو ان  
 پر چڑ نہیں چڑھتی۔“ راول نے اس کے سر پر  
 لگاتے ہوئے کہا۔

”تو کہہ لیں ماما بھائی کو تو بس موقع ملنا چاہیے  
 اس لیے ٹھکرتے ہوئے کہا۔

”راول مت تنگ کرو بھی میری بیٹی کو۔“ ان  
 نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے راول سے کہا۔

”اچھا تمہیں کیا کہنا تھا مجھ سے۔۔۔ جو ان  
 حضرات پر غصہ چڑھ رہا تھا۔“ وہ اس کی اس عادی  
 اچھی طرح آگاہ تھیں کہ وہ جب کوئی خاص بات  
 چاہتی تو انتظار اسے بڑا ٹھنکن دکھائی دیتا۔

”ہاں۔۔۔ دھیمے۔۔۔ ماما! بھائی کے لیے یہ لڑکی ام  
 ہے میں نے۔“ اس نے جوش بھرے انداز میں  
 جلدی اہم سیدھی کی اور انگلی رکھ کر تصویر دکھا  
 گئی۔

”ہیں۔۔۔ یہ لڑکیاں ڈھونڈنی کب سے  
 کر دی ہیں تم نے؟“ انہوں نے حیرانی سے اسے  
 ہوئے پوچھا۔

”ماما! آپ دیکھیں تو کیسی زبردست لڑکی  
 اس نے ان کی توجہ اہم کی طرف نہ دیکھ کر جلد  
 کہا۔ وہ چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی  
 ”سی! نہ تو شادی گڑیا گڈے کا کھیل“

اور نہ ہی صرف شکل و صورت کی بنیاد پر ایسے  
 کے جاتے ہیں اور بیٹا انسانوں کو جاننے اور  
 لیے تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے۔ پھر اپنے

کون لے سکتا تھا۔ اس سے اچھا پورے جگہ میں اور

پر چپت لگاتے ہوئے اس کے برابر آبیٹھا تو وہ گود میں  
 دھرا اہم اٹھا کر اپنی فریڈ کی تصویریں اسے دکھانے  
 لگی۔ ساتھ ساتھ ان کے بارے میں بتاتے لگی۔

”ویسے سنی یہ کچھ غیر اخلاقی سی حرکت نہیں لگتی  
 یوں کسی کی تصاویر دکھنا۔“ اس کے پر شوق سے انداز  
 پر راول نے قدرے رکتے رکتے کہا۔

”کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں بھائی۔ یہ سب کوئی  
 پردہ تھوڑی کتنی ہیں پھر غیر اخلاقی حرکت تو تب ہو کہ  
 کوئی لڑکی اس بات سے منع کرے کہ گھر میں بھائیوں کو  
 مائٹرز وغیرہ کو تصویریں نہ دکھاؤں اور اس کے باوجود  
 گھر جا کر سب کو دکھاؤں مگر آج کے دور میں اس بات کو  
 بڑا دقانونی سمجھا جاتا ہے۔ ہماری ایک کلاس فیلو ہے  
 امیر، پہلے وہ یہ اہم کے کر گئی ہوئی تھی اگلے دن واپس  
 لائی تو بڑی خوش خوش بتاتے لگی کہ اس کے بھائی کو  
 فلاں فلاں لڑکی کے فوٹو گرافس بہت پسند آئے۔ میں  
 سوچ رہی تھی کہ حائقہ ضرور اس بات پر ناراض ہوگی  
 مگر اس نے تو ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔“ اس نے تفصیل  
 سے راول کی بات کا جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کے  
 توقف کے بعد قدرے سنجیدگی سے بولی بولی۔

”بھائی! اصل میں میں یہ اہم اس لیے آپ کو  
 دکھا رہی تھی کہ۔۔۔“

”ہاں ہاں۔۔۔ بتاؤ بھی رک کیوں گئیں؟“ راول  
 نے اسے ہچکچاتے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

”یہ جو حائقہ کی کزن ہے نا، ہمارے ہی کالج میں  
 پڑھتی ہے۔۔۔ بے حد سوہری ہے۔“ ایک تصویر پر  
 فکر دھریے وہ بڑے شوق سے بتا رہی تھی اور راول

اس کی ان تعریفوں پر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔

”میرا دل چاہتا ہے بھائی! میں اسے اپنی بھائی  
 بنالوں سچی بھائی! اپنی کیوٹ سی ہے نا۔ عادات بھی بے  
 چہ اچھی ہیں۔“ وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان  
 تھی اور راول کے تصور میں ایک دم سے عروہ حسین  
 آ موجود ہوئی۔ وہ جو اس کے نو عمر دل کی اولین تمنا تھی  
 اس کی سب سے انمول خواہش تھی۔ بھلا اس کی جگہ

کون لے سکتا تھا۔ اس سے اچھا پورے جگہ میں اور

پر چپت لگاتے ہوئے اس کے برابر آبیٹھا تو وہ گود میں  
 دھرا اہم اٹھا کر اپنی فریڈ کی تصویریں اسے دکھانے  
 لگی۔ ساتھ ساتھ ان کے بارے میں بتاتے لگی۔

”ویسے سنی یہ کچھ غیر اخلاقی سی حرکت نہیں لگتی  
 یوں کسی کی تصاویر دکھنا۔“ اس کے پر شوق سے انداز  
 پر راول نے قدرے رکتے رکتے کہا۔

”کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں بھائی۔ یہ سب کوئی  
 پردہ تھوڑی کتنی ہیں پھر غیر اخلاقی حرکت تو تب ہو کہ  
 کوئی لڑکی اس بات سے منع کرے کہ گھر میں بھائیوں کو  
 مائٹرز وغیرہ کو تصویریں نہ دکھاؤں اور اس کے باوجود  
 گھر جا کر سب کو دکھاؤں مگر آج کے دور میں اس بات کو  
 بڑا دقانونی سمجھا جاتا ہے۔ ہماری ایک کلاس فیلو ہے  
 امیر، پہلے وہ یہ اہم کے کر گئی ہوئی تھی اگلے دن واپس  
 لائی تو بڑی خوش خوش بتاتے لگی کہ اس کے بھائی کو  
 فلاں فلاں لڑکی کے فوٹو گرافس بہت پسند آئے۔ میں  
 سوچ رہی تھی کہ حائقہ ضرور اس بات پر ناراض ہوگی  
 مگر اس نے تو ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔“ اس نے تفصیل  
 سے راول کی بات کا جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کے  
 توقف کے بعد قدرے سنجیدگی سے بولی بولی۔

”بھائی! اصل میں میں یہ اہم اس لیے آپ کو  
 دکھا رہی تھی کہ۔۔۔“

عرصہ پڑا ہے کیوں نہ ابھی بھائی کی منتی کر دیں۔ کچھ تو بلا گلا ہو۔“ شبینہ نے مہاراجہ دکھائی اور اس کی اس بات پر راول کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ دل میں بہن کو ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

”خیال تو تمہارا اچھا ہے تمہارے پیارے بھائی ان سے بات کر لی ہوں۔ کیا کہتے ہیں بھلا۔“ انہوں نے کہا اور کھانے کا انتظام کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ہر سو مسرتوں کی پریاں رقصاں تھیں۔ بہار کی دلفریبیاں من کو گدگدا رہی تھیں۔ نگار جیجی تھیں گلاب راتیں تھیں۔ گو مہاراجہ پیا اور شبینہ ابھی لاہور سے نہیں لوٹے تھے مگر شبینہ نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے ساری باتوں سے آگاہ کر دیا تھا وہ جو سدا سے اس کے دل میں بستی تھی جس کی چاہت اس کی رگ رگ میں خون کے ساتھ گردش کرتی تھی اس کے نام کردی گئی تھی بس کچھ ہی عرصہ تھا۔ پھر اسے ہر لمحہ ہر بل اس کی نگاہوں کے سامنے رہنا تھا۔ یہ تصور ہی یہ خیال ہی راول پر سرخوشی کی سی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔

وہ موسم بہار کا ایک بے حد خوبصورت دن تھا جب اس نے اس کی سپید سپید مخروطی انگلی میں منتی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس کے چہرے پر بکھرے قوس قزح کے دلفریب رنگوں نے راول کے دل میں کیسے کیسے ارمان نہیں جگائے تھے۔ لبوں کی تراش میں ایسی شرمیلیں سی مسکراہٹ۔ اسے بے خود سا کر دیا تھا۔

کتنی ڈھیروں منتوں سے اس نے انزلہ آپا کو منایا تھا کہ وہ اسے لباس نہیں بدلنے دیں گی اور ابی طے اسی سند روپ میں تھوڑی دیر اس سے بات کر لینے دیں گی۔ ڈھیروں باتیں تھیں جو وہ اس سے کرنا چاہتا تھا۔ اپنی چاہت کا اقرار اس سے سننا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت کو ہر لگ گئے تھے چند منٹ ایسے گزرے کہ اسے پتا بھی نہ چلا۔ ابھی تو نگاہوں کی پیاس بجھی تھی نہ دل ہی دیدار یار سے سیر ہوا تھا۔ لبوں نے کچھ کہا تھا نہ کانوں نے سنا تھا کہ انزلہ آتا آگئی تھیں۔

”جلدی سے آؤ راول، تمہارے کسی دوست کا

لڑکیاں ہوں تو ان ہی کو ترجیح دینی چاہیے۔ بے شک فیصلہ تو راول ہی کا ہو گا لیکن اس نے میری خواہش اور مرضی کو اولیت دی تو میری رائے یہی ہوگی کہ پہلا حق اپنوں ہی کا ہوتا ہے۔ کیوں راول تمہارا کیا خیال ہے؟“ بڑے قدرانہ انداز میں بات کرتے کرتے ساتھ ہی انہوں نے بیٹے سے پوچھ ڈالا۔

”میں آپ سے متفق ہوں مہاراجہ۔ میرے لیے آپ جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے دل و جان سے قبول ہو گا۔“ وہ کسی حد تک ان کی خواہش سے آگاہ تھا اس لیے بلا دھڑک بولا۔

”مگر مجھے خوشی تبھی ہوگی اگر آپ کی پسند نہ لڑکی شبینہ کو بھی پسند ہوگی تو۔“ اس نے بہن کا ہاتھ پھیلانے کے لیے اسے خوش کرنے کے لیے کہا اور واقعی وہ اتنے میں ہی مطمئن ہو گئی۔

”ابھی تو کافی عرصہ پڑا ہے راول کی تعلیم ختم ہونے میں۔“ وہ دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے کہیں۔

”ایگزامز کب ہو رہے ہیں راول؟“

”ابھی تو دو اڑھائی ماہ بڑے ہیں مہاراجہ۔“ اس نے کیا۔

”مہاراجہ کیا خیال ہے آپ کی بیٹی کے تو ایگزامز ختم ہونے والے ہوں گے۔“ وہ جانے کس رو میں پوچھ گیا۔

”اور اب جلد سا جھینپا جھینپا سا بیٹھا تھا۔ مہاراجہ ایک لمحے کو حیرانی سے اسے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کہیں۔

”کون سی بھتیجی کے؟“ انہوں نے قدرے ادا سے پھرے انداز میں پوچھا۔ شبینہ بغور بھائی کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کمال ہے یہ راول بھائی کے لیے جیسے رستم نکلے ہیں۔ بھائی کی پسند پر اسے دل کی ہولی تھی۔ پتا نہیں پہلے اس کا دھیان اس طرف نہ نہیں گیا تھا۔

”مہاراجہ بھائی عرصہ کی بات کر رہے ہیں۔ اسے ہی تو نے ایگزامز کے بعد بلوانے کو کہا تھا۔“ اس نے اس سے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ مہاراجہ نے اچھا کو لبہا کرتے ہوئے کہا۔

”مہاراجہ بھائی کی تعلیم مکمل ہونے میں تو ابھی خاصا

جسم پر گرے تو وہ چونک بڑا۔ آسمان پر ہر طرف گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش لگے بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

”اوہ میرے خدا۔ ممانے اگر ماموں کی طرف فون کر لیا تو بے حد پریشان ہو جائیں گی۔“ اس نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سوچا۔

باہر آسمان برس رہا تھا اور اندر اس کی آنکھوں نے جل تھل کیا ہوا تھا۔ راول کی دکھ اور حیرت سے کھلی آنکھیں اس کے دماغ سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ آنکھیں جن سے ہر دم محبت کی شعاعیں پھوٹا کرتی تھیں وہ آنکھیں جو بس چاہتوں کی برکھا برسانا جانتی تھیں۔ کیسے ان میں درد پھیل گیا تھا۔ حیرت اور بے یقینی جیسے ان میں نمود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور ان آنکھوں میں یہ طغیانی لانے کا سبب وہ خود بھی یہ اس کی زبان سے نکلنے والے لفظوں کے تیرتھے جنہوں نے

راول کو زخم زخم کر دیا تھا۔ اس کا مان اس کا اعتماد پرزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اور یہ مدینے خود اس کے اپنے وجود کو بھی ادا لمان کر گئے تھے۔ وہ اگر ٹوٹا تھا تو وہ خود بھی تو بری طرح کرجی کرجی ہو گئی تھی۔ وہ جیسے ہارے ہوئے شکست سے قدموں سے واپس ہوا تھا وہ منظر اسے کیسے کیسے نہیں رلا رہا تھا۔ اف! اس قدر اذیت ناک ہے یہ سب برداشت کرنا۔ اس نے درد سے پھٹتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے سوچا۔ کیا کرے وہ؟ کیا اپنا فیصلہ بدل دے؟ سب کچھ قسمت پر چھوڑ دے اور خود کو حالات کے دھارے پر بنے دے۔ کیا صحیح ہے کیا غلط۔ جانے کس وقت الجھتے الجھتے نیند کی دیوی نے اس کے تھکے ہارے وجود کو اپنی مہولان ہانہوں میں سمیٹ لیا اور وہ وقتی طور پر زندگی کے بھنبھوں سے آزاد ہو گئی۔

صبح جب کافی دیر تک وہ اپنے کمرے سے نہ نکلی تو انزلہ آتی پریشان سی چلی آئیں۔ اس کی سوچی ہوئی آنکھیں اور اترا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ ہاتھ تھاما تو وہ تپ رہا تھا۔

”عروہ! تمہیں تو بہت سخت بخار ہے۔“ انہوں نے

نے فکر مندی سے کہا۔ اور پھر اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ اسے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔

ڈاکٹر عابد کے پاس کافی رش تھا۔ وہ دونوں ایک طرف لگے صوفوں پر آ بیٹھیں۔ حالانکہ گیٹ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہی ڈاکٹر عابد کا کمرہ تھا مگر اس وقت اس ذرا سے فاصلے نے ہی اسے تھکا ڈالا۔ آنکھیں موندتے ہوئے اس نے سر صوفے کی پشت سے نکال لیا۔

”ہیلو عروہ۔“ مانوس سی آواز تھی اور کندھے ہاتھ کا دباؤ۔ عروہ نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ اس کی کلاس فیلو در وہ تھی۔ ”کیا ہوا ہے عروہ؟ اس قدر زرد کیوں ہو رہی ہو؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”زرد نہیں بھی، بس ہلکا سا بخار ہے مگر انزلہ زبردستی تھک بیٹ لائیں، تم سناؤ کیسی ہو؟ ادھر کیسے نظر آ رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”رومان آئی ایڈمرٹ ہیں یہاں، میری فر کزن ہیں ان کی عیادت کے لیے آئی تھی میں امی ساتھ۔ وہ سو رہی ہیں اور امی دبا آئی کے ساتھ امی میں لگ گئی ہیں۔“

”دبا آئی؟ کیا سمن آباد میں رہتی ہیں یہ۔۔۔؟“

”ہاں ہاں، آپ کیسے جانتی ہیں انہیں؟“

”ہمارے ساتھ والا گھر ہی تو ان کا ہے۔“

”رُجبڈی ہوئی ہے بے چارے رومان کے ساتھ بھی اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔“ انزلہ آتا ہے ہمدردی سے کہا تھا۔

”بعض لوگ اپنی قسمت خود ہی خراب کر ہیں آئی اور بعد میں تقدیر کو دوش دینے لگتے ہیں سوچتے کہ یہ تو ہمارے اپنے اعمال کی ان ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟“

پوری توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی اس چونک کر بے حد بے چینی سے پوچھا۔

”مطلب میں تمہیں بتانی ہوں بیٹی۔“

ہے پیچھے سے اچانک سامنے آتے ہوئے کہا تو ایک  
لے کے لیے وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ درودہ کی حالت سب  
سہ پتی تھی۔

”آؤ کمرے میں آجاؤ تم لوگ۔“ اس نے عروہ کا  
ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف  
مستی ان کے پیچھے چلنے لگیں۔

رومان سو رہی تھی زردی اس کے چہرے پر یوں  
ل رہی تھی جیسے ہلدی مل دی گئی ہو۔ آنکھوں کے  
سیاہ حلقے صاف نظر آ رہے تھے۔ ”بیٹھو تم لوگ۔“  
انہی نے کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”ماوشی۔“ سے بیٹھ گئیں۔ عروہ کی نگاہیں وہ رہ کر رومان  
کمزور سر پر جا ٹھہریں اور وہ دل ہی دل میں اس پر  
دھانے والوں کو کونسنے لگتی۔

”تمہاری امی اس دن مارکیٹ میں ملی تھیں،  
میں نے انہیں کہ رومان کے ساتھ ہونے والے حالات  
میں اس قدر خوف زدہ کر دیا ہے کہ تم شادی سے  
ہاری ہو۔ تو عروہ بیٹی اصل حالات وہ نہیں ہیں جو تم  
رہی ہو۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ  
ہمارے سامنے اقرار کر لوں کہ قصور ہمارا اپنا ہے۔  
میں لفظوں میں یہ ہمارے اپنے ہی اعمال کی سزا  
”انہوں نے دھیرے دھیرے کہا۔ وہ تو یہ سمجھ  
تھی کہ وہ ناراضگی سے کہہ رہی ہیں مگر وہ بالکل  
بے ہیں۔

”یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میں نے رومان کی شادی  
کی بہن کے گھر کی۔ بیٹی کی شادی کرتے ہی بہن کی  
بانے کہاں جاسوئی تھی کہ عام سی بات بھی رومان  
مائی کہ آئی نے مجھے یوں کہا ہے تو مجھے بے حد  
آ۔ اس غصے کی حالت میں میں نے نہایت عجلت  
ان کا بیوت دیتے ہوئے رومان کو یہ بیٹی پر مائل کی کہ وہ  
ا قابو کر لے۔ باقی گھر والوں کی کوئی بات سننے کی  
ضرورت نہیں۔ رومان ویسے بھی قدرے تیز  
تھی۔ میری شہ پر اس نے سسرال والوں کو بالکل  
رکھ لیا، فراز جو پہلے ہی محبت کرتا تھا اب جو اس  
میں طور پر اس کی آؤ بھگت کی تو وہ اس کا دیوانہ

ہو گیا مگر اس کے خیر میں گند حائل باب کا احترام اور  
بہن بھائیوں کی محبت وہ تمام تر کوشش کے باوجود نہ  
نکل سکی۔ شروع شروع میں تو وہ اس کے والدین سے  
ناروا دیے پر نرمی سے سمجھانے پر اکتفا کرتا رہا مگر اس  
کی نرمی سے ہم لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ رومان تو  
پھر کچی بھی مجھے بھی عقل نہ آئی۔ رومان کے ہاں بیٹے  
کی سیدائش ہوئی تو میں نے جانا کہ اب اس کے قدم  
اس گھر میں اتنے مضبوط ہو گئے ہیں کہ اب وہ جو مرضی  
کر لیتی رہے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پتا نہیں کبھی  
کبھی ہم اپنی دوغلی پالیسی کیوں اپنا لیتے ہیں کہ بہو کی  
ذہنی باتیں وہ رویہ جو ہمیں بے حد گراں گزرتا ہے وہی  
رویہ جب بیٹی اپنی سسرال میں اپناتی ہے تو ہم خوش  
ہوتے ہیں اور اس پر بڑا فخر کرتے ہیں ہماری بیٹی کا  
سسرال میں بڑا رعب و دبدبہ ہے۔ بڑی چلتی ہے اس  
کی پتا نہیں ان دنوں کیا ہو گیا تھا مجھے ہر وہ بات جس پر  
میرا فرض تھا کہ میں رومان کو نوٹی اسے سمجھاتی میں  
اس پر خوش ہوتی بے حد کم ظہری پر اثر آتی تھی میں پتا  
نہیں اولاد کی محبت میں یا کم ظہری سے ہی پیچھے میں ہی  
شامل تھی۔ ”انہوں نے ایک کمری ٹھنڈی آہ بھری اور  
چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئیں۔ عروہ نے بے حد  
نأسف سے اس کی جانب دیکھا۔

”سناں نند اگر بچے کی چاہ میں کمرے میں چلی  
آئیں تو رومان کے ماتھے پر ہل پر جاتا۔ وہ اگر بچے کو  
اپنے کمروں میں لے جانے کی خواہش ظاہر کرتیں تو یہ  
صاف منع کر دیتی۔ بس بیٹی کیا کیا جاؤں ہم نے حد ختم  
کر دی تھی ورنہ میری بہن نے تو بہت صبر کیا اور شاید  
اس کا صبر ہی پڑا ہے ہم پر۔ فراز نے رومان کی ہر زیادتی  
کو برداشت کیا۔ نندوں نے بھی دو بدو اس سے زبان  
نہیں چلائی۔ دیور نے بھی بد تمیزی نہیں کی۔ بہت  
ڈھونڈنے سے بھی کہیں ان کی کوئی خطا نظر نہیں آتی۔  
ساری غلطیاں ہماری ہیں۔ ساری خطائیں ہماری ہیں۔  
دروہ ٹھیک کہہ رہی تھی ہمیں اپنے ہی اعمال کی سزا ملی  
ہے۔ مائیں تو بیٹیوں کا گھر بساتی ہیں، انہیں اگلے گھر کو  
جنت نظیر بنانے کے گر سکھاتی ہیں مگر میں کیسی ماں

ہوں جس نے اپنی کم عقلی اور نادانی کی وجہ سے بیٹی کا گھر اجاڑ دیا۔ اسے برباد کر دیا۔ آہ۔ کس قدر ظلم کیا ہے میں نے۔ خود اپنی ہی اولاد کے ساتھ۔ کچھ تاؤوں کے ناگ دن رات مجھے ڈتے ہیں۔ اپنی ہی نادانیاں ہر دم لہو رلاتی ہیں۔ آہ۔ اب کچھ تاؤے کیا ہوت جب چڑیاں چک گئیں کھیت۔

اس دن جو کچھ ہوا وہ جس قدر غیر متوقع ہمارے لیے تھا یقیناً "اسی قدر میری بہن کے گھر لانے کے لیے بھی تھا۔ میں اس دن بازار سے واپسی پر رومان کی طرف چلی گئی تھی۔ دینی کے لیے کچھ چیزیں لی تھیں سوچا دینی حامل ہوں۔ بڑا آب واکر میں چلنے لگا تھا۔ رومان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ باہر نہ نکلے مگر وہ بچہ تھا جو نہ دروازہ کھلتا باہر نکل جاتا۔ دو کمرے تھے رومان کے پاس جگہ ہی کہاں تھی اتنی اس کے کھیلنے کے لیے۔ اس دن جو نہی وہ باہر نکلا وادی اسے اٹھا کر پونے لگیں۔ رومان نے دیکھتے ہی اس بری طرح سے اسے ان سے جھپٹا کہ وہ جو کئی دنوں سے بیمار تھیں سنبھل نہ سکیں اور دھکا لگنے کی وجہ سے دیوار سے جا ٹکرائیں۔ کمزوری تھی یا صدمہ یا ہم لوگوں کی شامت اعمال کہ دیوار سے ٹکرا کر وہ نیچے گر کر بے ہوش ہو گئیں۔ یہ سارا کچھ فراز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں جو ٹک سی ساکت و جاہد کھڑے فراز کو دیکھ رہی تھی تیزی سے آگے بڑھی اور اسی وقت اسے جیسے ایک دم ہوش آگیا۔ اس نے چیخ کر چھوٹے بھائی سرفراز کو آواز دی جو ڈاکٹر ہے پھر لپک کر رومان کی طرف بڑھا۔ دینی کو چھین کر رومان کو میری طرف دھکا دیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے شعلے کی مانند وہ لفظ نکلا جس نے سب کچھ بل میں جلا کر خاکستر کر ڈالا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ سب کچھ۔" وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے بری طرح سنسنے لگیں۔

وہ بیٹوں پتھر کے بتوں کی مانند ساکت و جاہد بیٹھی انہیں دیکھتی رہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے انہیں چپ کر وائیں۔ کون سا حرف تسلی کہیں جو ان کے دکھ کا مداوا بن جائے جو ان کے زخموں پر مرزم کا کام

دے جائے مگر بے حد سوچ بچار کے باوجود کوئی ایسا بھائی نہیں دے رہا تھا بلکہ زبان سے نکلنے کو تیار تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حرف و لفظ کا تاجیہ لیے زبان سے منقطع ہو گیا ہو۔ آخر درود کی اسی آگے بڑھ کر دھیرے۔ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رہا۔ انہیں ساتھ لگایا اور آہستہ آہستہ دلا سا لگیں۔ رومان بھی جاگ چکی تھی اور خلی خالی اسے انہیں تک رہی تھی۔ انزلہ آئی اور درود جاگتے دیکھ کر اس کی طرف بڑھیں جبکہ عروہ کم کیفیت میں ساکت بیٹھی آئی دیا کی جانب کئی کانی دیر کے بعد جب وہ کسی حد تک سنبھل دھیرے سے اسے مخاطب کر لی ہوئی بولیں۔

"عروہ بیٹی! ہمیشہ ساس کا قصور نہیں ہوتا۔ شوہر ظالم اور بے حس ہوتا ہے۔ کبھی کسی لڑکے ہی اپنی بربادی کا سامان کرتی ہیں اور کبھی عاقبت نا اندیش مائیں بیٹیوں کو اجاڑ ڈالتی انہوں نے طویل اور ٹھنڈی سانس لی اور بے کسی بیٹی کی طرف متنے لگیں۔

"میرا تو یہ خیال ہے آپا کہ ہم اپنی بیٹیوں دن ہی یہ سمجھائیں کہ جیسے ہم تمہارے احترام ہیں اسی طرح شوہر کے والدین بھی نزدیک عزت و احترام کے حق دار ہونے چاہیے۔ دل کی گہرائیوں سے انہیں والدین کی جگہ تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں سسرال والوں کی بہت سی باتیں صرف اس بری تھی ہیں کہ دل میں پہلے سے ان کے کدورت ہوئی ہے ہمیں چاہیے کہ ہم الٹی

انتہائی خوش بختی ہے۔ جبکہ ہم ماؤں کا فرض تو یہ ہے کہ ہم اپنی بچیوں کو ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کریں۔ یہ طے ہے کہ من چاہی زندگی ہر کسی کو نہیں ملتی۔ ہاں صبر و استقامت، ہمت و حوصلے اور فہم و فراست کے اوصاف کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی کو اپنے پسندیدہ ڈھب پر لایا جاسکتا ہے۔ مسلسل کوشش سے حالات کو وقت کو اپنا تابع ضرور کیا جاسکتا ہے گو ایسا کرنا کچھ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن قطعی نہیں۔ مجھے تو کامل یقین ہے کہ اگر ہم اپنی بیٹیوں میں یہ اوصاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کوئی گھر کبھی برباد نہ ہو۔ کوئی بیٹا کبھی اجڑ کر میکے نہ آئے غور کرنے کی بات ہے کہ محبتوں اور چاہتوں کی قدیلوں سے راہیں روشن ہوں تو منزل پر پہنچنے میں راہی کا کیا کمال۔ کمال تو یہ ہے کہ راہیں الملوں کی بات جیسے گھوڑا اندھیرے میں اچھٹی ہوں اور بندہ اپنے اندر کی روشنی سے راہوں کا تعین کرتا ہو اور اھر بھٹکے بنا سیدھا منزل پر جا پہنچے۔

ان کے بچے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ وہ سحرزدہ سی سن رہی تھیں۔ ایک ایک لفظ جیسے دل کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ ہاتھیں کچھ لڑکھانے کے پاس یہ کیسا فن ہوتا ہے یا پھر یہ خدا داد صلاحیت ہوتی ہے کہ لفظ ان کے منہ سے نکلتے ہیں اور سننے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ دل میں اترتے ہیں بلکہ اندر کی حالت کو یکسر بدل ڈالتے ہیں۔ وہ دونوں بہنیں بھی جب اس اسپتال کی عمارت سے باہر نکلیں تو ان کی دل کیفیت پہلے سے بے حد مختلف تھی۔ انزلہ ایک نئی سوچ کے ساتھ سرال جانے کا سوچ رہی تھی۔ عروہ بھی اپنے شادی نہ کرنے کے فیصلے کو پچکانے بلکہ بے وقوفانہ قرار دیتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ شادی نہ کر کے ہر وقت بھائیوں کی جلی کٹی باتیں سننے اور والدین کے بعد باجھ ہواؤں کی مانند کبھی ایک بھائی اور کبھی دوسرے بھائی کے پاس ڈولتے پھرنے سے ہزار درجے بہتر تھا کہ ایثار و قربانی اور صبر و استقامت کو اپنا شعار بناتے ہوئے ایک ایسے آشیانے کی بنیاد رکھی جائے

سمجھائیں کہ اگر لمبی وقت سانس سربرا بھلا کہہ بھی دیں تو یہ سوچ کر برداشت اور تحمل سے کام لیں کہ اپنے والدین بھی تو ڈانٹ ڈپٹ دیتے ہیں اگر انہوں نے کچھ کہہ دیا ہے تو پھر کیا ہے۔ دوسرا ہمیں اپنی بچیوں کو یہ سمجھانا چاہیے کہ گزارا صرف شوہر سے نہیں ہوتا بلکہ پورے خاندان سے نبھایا جاتا ہے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے پورے خاندان کو سمجھنا پڑتا ہے۔ پورے خاندان کو سمجھنے کے لیے سب کے دل میں اترنے کے لیے کیسا رویہ اختیار کیا جائے۔ کون سا کر آویلا جائے یہ سب بتانا۔ ایسی ساری باتیں سمجھانا ہم ماؤں کی ہی ذمہ داری ہے۔ انزلہ کیا اور وہ رویوں سے ملنے کے بعد ان کے قریب آ بیٹھی تھیں اور بغور ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

”سب کو خوش رکھنا کیسے ممکن ہے آئی؟“ انزلہ

اپنے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”بالکل ممکن ہے بیٹی۔ سانس سر جو کچھ بھی کہے میں ہنس کر سہ لیا جائے ان کو والدین سمجھ کر ان کو احترام دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ بہوان کے دل میں ہلکا نہ بنا پائے۔ وہ گئے دیور، ننڈیں تو دیور تو ظاہر ہے عایم، جاب یا بزنس کے سلسلے میں دن کا بیشتر حصہ باہر گزاریں گے، ہاں جب وہ گھر آئیں تو خود کو بھالی سمجھ کر نہیں بلکہ ان کی بہن سمجھ کر جہاں تک ممکن ہو ان کی پھولی موٹی ضروریات کا خیال رکھیں۔ ننڈوں کے ہاتھ یوں گھل مل کر رہیں جیسے اپنی بہنوں سے رہتی ہیں۔ ان سے ان کی دلچسپی کے مطابق گپ شپ لیں۔ طریقے سے ان کے پسندیدہ موضوعات چھیڑ کر لپ پریات چیت کریں۔ اپنے کمرے میں لی وی لرا مز دیکھنے کے بجائے سب کے ساتھ بیٹھ کر لی وی لیں۔ ان کی خوشیوں کو شیئر کریں۔ زیادہ کام ان پر لگنے کے بجائے ننڈو کرنے کی کوشش کریں تو یقیناً ”بہو اور ننڈ بھاون کی روایتی چچکاش“ بعد اور بعض فوری ختم ہو کر رہ جائے اور وہ گھر جنت کا نمونہ نظر لگے۔ کسی لڑکی کو اچھا گھر، محبت کرنے والی ال اور جانثار کرنے والا شوہر مل جائے تو یہ اس کی

طنز سے انداز میں پوچھا۔  
 ”کمال ہے۔۔۔ وہ تو کچھ بولی ہی نہیں پھر اس نے  
 کیسے اسے پہچان لیا ہے۔ کیا محبت میں الہام بھی ہوا  
 کرتے ہیں۔“ اس نے حیرانی سے سوچا۔

”میرے پاس اتنا فالتو نام نہیں ہے محترمہ! جلدی  
 سے بتائیں کہے بلا دوں ماما کو یا پھر شبنم کو؟“ وہ اکھڑے  
 اکھڑے سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کا یہ انداز کس  
 قدر اجنبی سا تھا اس کے لیے۔ وہ تو ہمیشہ والہانہ انداز  
 میں ملا کرتا تھا۔ ایک دم اس کے دل کو جیسے کوئی مٹھی  
 میں لے کر بھینچنے لگے۔ ”اوہو بھی بول بھی چکیں۔ کیا  
 کوئی نام ختم ہو چکی ہے۔“ اب وہ بری طرح جھنجھلا رہا  
 تھا۔

”راول! مجھے مجھے آپ سے ہی بات کر  
 لیں۔“ اس نے دھڑوہڑ کرتے دل کو بمشکل سنبھال  
 اٹکتے اٹکتے کہا۔

”زہ نصیب۔۔۔ مری حیرت کی بات  
 اس کا لہجہ ہنوز طنز سے تھا۔  
 ”کیوں حیرت کی بات کیوں؟“ عروہ نے

اختیار کیا۔  
 ”عروہ حسین، ہاں! اس خاکسار کو یاد کر  
 حیرت کی بات ہی تو ہے۔“

”راول! یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جو کسی  
 جائیں جو دل میں بستے ہیں وہ تو ہر دم نگاہوں  
 رہتے ہیں کسی پل بھی نگاہوں سے اوچھل  
 پھر انہیں یاد کرنے کی نوبت کیسے آئے۔“ اس  
 ہمت کر کے کہا اور ریسیور کرڈیل پر ڈال دیا  
 یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہواؤں میں پرواز  
 سو مسرتوں اور خوشیوں کی پریاں رقص  
 عجیب سے نشے سے سرشار بے خود کھڑا تھا

جس کا سب سے اہم ستون خود بنا جائے ایک ایسا ستون  
 جس کی عدم موجودگی سے اس کے آشیانے کی بقا کا  
 تصور بھی محال ہو۔ خود ساختہ سوچوں کا بار گراں دل و  
 ذہن پر سے اترتا تو وہ خود کو بے حد کا بھلا محسوس کرنے  
 لگی۔ ساتھ ہی ایک نئی فکر نے آگھیرا کہ اب راول کے  
 ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی کس طرح کرے۔ کیوں  
 نہ انزلہ کے ساتھ پھوپ کی طرف چلی جاؤں اور اس سے  
 سوری کر لوں۔۔۔ نہیں یہ میرے لیے بڑا مشکل ہے۔  
 اس نے خود ہی سوچا اور پھر اس خیال کو سوچ کر روک  
 کر دیا۔

”عروہ اترو بھی۔۔۔ کھانا گرم ہو۔“ رکشا رک چکا  
 تھا اور انزلہ تیار اور سیور کو کرایہ دینے کے بعد اسے اندر  
 ہی بیٹھے دیکھ کر حیرت بخیزی نگاہوں سے اسے دیکھتی  
 اترنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ افسانہ کیا سوچے گا یہ  
 رکشے والا بھی۔ وہ جھل جھل سی نیچے اتر آئی۔  
 ”عروہ حد نہیں کر دی تم نے۔ کس سوچ میں گم  
 تھیں۔“ اس کے برابر چلتے ہوئے انہوں نے بغور اس  
 کا چہرہ دیکھا۔

”یونہی بس۔۔۔ درد کی ای کی باتوں پر غور کر رہی  
 تھی۔“ اس نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔

”ہاں بھی کمال کی عورت ہیں تمہاری دوست کی  
 امی۔ میں تو ان سے بے حد امپریشن ہوئی ہوں۔ ایسے  
 لوگوں سے تو ملتے رہنا چاہیے۔ تم بیٹھو میں درد گرم  
 کر کے لاتی ہوں۔ میڈ۔ سن لے کر کچھ دیر آرام کرو  
 انشاء اللہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ انہوں نے محبت  
 سے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے دروازے  
 سے نکلتے ہی وہ تیزی سے فون کی جانب پھکی۔ ریسیور  
 کان سے لگاتے ہوئے کپکپاتے ہاتھوں سے ممبر ڈائل  
 کیا۔ پہلی ہی بیل پر ریسیور اٹھالیا گیا تھا۔ ”ہیلو!“ اس  
 کی خوب صورت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ  
 یوں سرخ پڑ گئی جیسے وہ اس کے سامنے ہی تو کھڑا ہو۔  
 لفظ ہمیشہ کی طرح کہیں گم ہونے لگے۔

”فرمائیے عروہ حسین، کس سے بات کرنا چاہتی  
 آپ؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد راول نے